اردو گیت کے سماجی محرکات کلاسیکی و عصری تناظر

ڈاکٹر یاسمین۔ پاکستان

Abstract

Geet is considered to be a genre of Urdu poetry that has reflected the emotions of women of subcontinent in the best possible way. Geet is proved to be the most suitable form of poetry to express mirth as well as woe. Geet erupts from the hearts of women both as a serenade and as a sigh. Though Love have always been the favourite topic of Geet but the aspects of life have also been covered. Urdu Geet not only encompasses the emotions of union and severance within couples but it extends over the emotions related to other relationships too. Like any other genre of literature, Geet also represents the culture, traditions and values of a civilization. On one side, Geet affects the cultural practices of the country whereas on the other hand, it absorbs the impact of changing social values. Urdu Geet that emerged from India of Ameer Khusro has witnessed highs and lows of different eras and has made its way in to central and regional pieces of expression in Pakistani poetry. Today the Pakistani Urdu Geet includes topics like creation of Pakistan and the pain, perturbation and anguish associated with the phenomenon of Partition, Patriotism, Rituals and Social issues of rural and urban areas of Pakistan.

گیت اردو شاعری کی وہ صنف ہے جو برصغیر پاک و ہند کے عوام، بالخصوص عورتوں کے دل کی آواز ہے۔خوشی یا غم کے موقع پر جذبات کی ترجمانی کے لیے اس سے بہتر کوئی صنف نہیں۔عورت کے لبوں سے واہ بھی گیت کی شکل میں نکلتی ہے اور آہ بھی۔ گو کہ گیت کا خاص موضوع محبت رہا ہے مگر زندگی کے دیگر پہلوؤں کا عکس بھی گیت میں ملتا ہے۔اردو گیتوں میں نہ صرف محبوب سے ہجر و وصال کے جذبات کا اظہار ملتا ہے بلکہ دیگر رشتوں سے وابستہ جذبات بھی نظر آتے ہیں اور سماج کے دیگر معاملات سے جذباتی وابستگی بھی۔دیگر اصناف ادب کی طرح گیت بھی اپنے ملک کی ثقافت، تہذیب واقدار کی آئینہ دار ہے۔گیت کہیں تہذیب وثقافت پر اپنے اثرات مرتب کرتے ہیں تو کہیں بدلتے ہوئے سماجی اقدار گیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔اردو گیت کا سفر امیر خسرو کے ہندوستان سے شروع ہو کر زمانے کے اتار چڑھاو سے گزرتے ہوئے پاکستان کے مرکزی و علاقائی سماج کا ترجمان بن چکا ہے۔قیام پاکستان کے بعد گیتوں کے موضوعات میں شہری و دیہی سماج، تقسیم ہند پر کرب و اضطراب، ہجرت کا کرب، وطن عزیز سے محبت اور عزم نو اور مقامی رسم و رواج جگہ پا گئے ہیں۔کہتے ہیں جب مرد عورت کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے تو غزل بنتی ہے اور جب عورت مرد سے دل کی بات کہتی ہے تو گیت جنم لیتا ہے۔

گیت ہندوستان کی سرزمین سے پھوٹنے والی وہ صنف ہے جس میں عوام بالخصوص خواتین کے جذبات کا اظہار ملتا ہے۔گیت کے لغوی معنی راگ، نغمہ اور سرور کے ہیں اور اس کا مقصد گانا ہے۔جب پیار و محبت سے وابستہ امنگیں، حرمتیں اور خواہشات دلکش انداز بیان اور موسیقی کی آہنگ کے ساتھ ہمارے کانوں میں رس گھولتے ہیں تو چند گھڑیوں کے لیے ہم اس سحر میں کھو جاتے ہیں اور اپنے جذبات ٹٹولنے لگ جاتے ہیں۔گویا گیت دل کی زبان سے ادا ہوتا ہے اور دل کی دنیا پر اثر رکھتا ہے۔محترمہ قیصر جہاں کہتی ہیں۔

> " گیت نہایت داخلی اور شخصی صنف ہے۔اس میں ایک موڈ، ایک خیال اور ایک جذبہ کا بیان ہوتا ہے۔جذبے کی یک رنگی دل پر بھرپور نقش چھوڑتی ہے اور اس کی نغمگی پڑھنے والے پر ایک کیفیت طاری کر دیتی ہے۔"1

گیت اگرچہ مرد، عورت، بچہ، بوڑھا، جوان سب میں یکساں مقبول ہے مگر آج تک ادب کے دیگر اصناف کی طرح اسے وہ مقام حاصل نہ ہو سکا اس کی وجہ اردو ادب کا مزاج اور افتاد طبیعت ہو یا زمانے کے حالات یا

ادب میں خواتین کے جذبات کو اہمیت نہ دینے کا رجحان۔

''مگر یہ حقیقت ہے کہ خواتین نے جن کا گیتوں کی تصنیف، گیتوں کے موضوعات، گیتوں کے اندازِ بیان، گیتوں کی زبان اور گیتوں کی موسیقیت سے گہرا تعلق رہا ہے۔ گیتوں کو زندہ رکھنے کی کوشش اور اسے سینہ بہ سینہ منتقل کرتی رہیں۔2

کسی ملک کا سچا اور کھرا ادب گیت ہوتے ہیں جس میں صرف انسان ہی انسان رسا بسا ہوتا ہے۔ اس کی چاہ، اس کی لگن، اس کی خوشی، اس کی اُمنگ، اس کا ذوق، اس کا شوق، اس کا دکھ، اس درد اور اس کے ساتھ اس دھرتی، اس آکاش، اس ہوا، اس پانی، ان صبحوں ان سویروں۔ ان سانجھوں کی جھلکیاں ہوتی ہیں جن میں اس کا جیون گزرتا ہے۔3

گیت کا خاص موضوع محبت رہا ہے اور جذبات سے گندھی عورتوں کے گیتوں میں (بقول اختر اور بینوی) ہجر و وصال کے قصے، مظالم و بیداد کی داستانیں، ارمان تمنا کی نیرنگیاں، من کی موج اور جی کا سوگ، چنچل پن، بیواؤں کا بروگ، زندگی کی مسکراہٹ اور موت کے آنسو سب ہی کچھ پائے جاتے ہیں۔4 مطلب عورت کے لبوں سے واہ بھی گیت کی شکل میں نکلتی ہے اور آہ بھی۔

عورت محبوب سے ملتی ہے تو گاتی ہے۔

چھاپ تلک سب چھین لی رے موسے نیناں ملائے کے۔

میں تو تو ہے نہ چھاڈوں گی اے سانورے موسے نیناں ملائیکے (امیر خسرو)

ساون آئے تو گاتی ہے

اماں میرے باوا کو بھیجو ری کہ ساون آیا (امیر خسرو)

محبوب کی جدائی ستاتی ہے تو گاتی ہے

دھان نہ بھاوے، نیند نہ آوے، برہ ستائے موئے
گھائل سی گھومت پھروں رے مرا درد نہ جانے کوئے

اردو گیت کا بڑا ذخیرہ جو ہندوستان سماج کے نچلے طبقہ یا عورتوں نے اپنے ذاتی تجربات، واردات قلبی، جذبات اور تخیلات کی بنا پر تخلیق کیا وہ کسی کتابی شکل میں ہم تک نہیں پہنچا لیکن کچھ لوک داستانیں اور اساطیری کہانیاں نہایت بصیرت افروز ہیں۔ بہار میں "بدسیا" کے جذباتی گیت، "پنچ پھولا"، "رانی کی کہانی" اور "کھا گھر" کی کہاوتیں عام پسند ہیں۔ بابل کے گیت، ساون کے لہکتے ہوئے گیت آج بھی عوام میں پسند کیے

جاتے ہیں۔گیتوں کی ایک قسم لوک کہانی زمانہ قدیم سے گیتوں کی شکل میں عوام کے مجمعوں میں گائی جارہی ہے۔ ہندوستان میں سورداس اور میرابائی کے گیتوں اور رہسیوں کی شکل میں پرتھوی راج اور سنجوگیا کا واقعہ، پدمنی اور بادل کا قصہ گیت کی شکل میں زبان زدِ عام ہے تو پاکستان میں ہیر رانجھا، سسی پنوں، عمر ماروی، سوہنی مہینوال کی داستان مقامی زبانوں کے گیت میں ڈھل کر عوام میں بے حد مقبول ہیں۔

نفیس اقبال نے اردو گیت نگاری کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔سب سے پہلے دکنی دور ہے دکنی زبان مزاجاً ہندی گیت کی روایت سے منسلک تھی اسی لیے دکنی زبان کی شاعری بڑی حد تک ہندی گیت کے مزاج کی حامل ہے۔دکن کے دو بڑے گیت نگار ابراہیم عادل شاہ اور علی عادل شاہ شاہی تھے۔دوسرا دور شمالی ہندوستان میں 1857ء تک کا ہے۔اس میں "اندر سبھا" میں لکھے گئے اردو گیت ملتے ہیں۔ تیسرا دور اردو ڈراموں میں گیت نگاری کا ہے۔اس سلسلے میں احسن، بے تاب اور آغا حشر کے نام قابل ذکر ہیں۔چوتھا دور جدید دور میں گیت نگاری کا ہے۔جدید گیت نگاروں میں عظمت اللہ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔5 اس دور میں گیت کو اردو کے مزاج سے قریب تر کرنے کی روش کا آغاز تو عظمت اللہ سے ہوا لیکن اسے فروغ اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری نے دیا۔ 6

اردو گیت کا سفر میراجی تک پہنچ کر ایک نئی توانائی حاصل کرتا ہے۔میراجی کے دور میں اردو گیت نگاری نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی اور اس تحریک کے علمبرداروں میں اندر جیت شرما، آرزو لکھنوی، حفیظ ہوشیار پوری، مجروح سلطان پوری، ضیا فتح آبادی، امیر چند قیس، بسنت سہائے اور مقبول حسین احمد پوری وغیرہ بھی شامل ہو گئے۔

یہ کہنا شاید درست نہ ہو کہ گیتوں نے ایک واحد اجتماعی ثقافت کی ترجمانی کی ہے مگر یہ صحیح ہے کہ ہر دور میں کسی نہ کسی طبقہ کی ثقافت کے کسی نہ کسی پہلو کی ترجمانی گیت نے ضرور کی ہے۔ابتدائی گیتوں نے ہندوؤں کے رسوم ورواج، تہذیب وثقافت اور مذہبی عقائد کو جگہ دی تو مسلمان صوفی شعرا کے گیت مسلمانوں کی ثقافت کے ترجمان تھے۔جن میں مسلمانوں کا مذہب، مسلمانوں کا کلچر اور مسلمانوں کی معاشرت کے متعلق کوائف شامل تھے۔ امیر خسرو کے گیت کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے جو عابد علی عابد کا مضمون "پاک وہند کی کلاسیکی موسیقی کا ثقافتی مراج اور امیر خسرو" سے ماخوذ ہے۔

ارج سنو آج موری پیر مورے
چرن چھونے کی لاج رکھ مورے
مورے پیارے پیر

تمہیں تو میری بندھاؤ دھیر

پیر مورے

ارج سنو آج پیر مورے6

لیکن امیر خسرو نے جہاں گیتوں کا اجتماعی مزاج روحانی اور مذہبی رکھا وہاں ساون اور بابل کے گیتوں کے ذریعے دنیاوی معاملات اور انسان کے مادی، بنیادی اور اساسی جذبات کی ترجمانی کی بنیاد بھی ڈالی۔

اس ضمن میں امیر خسرو کے گیت کے چند اشعار ملاحظہ کریں۔

کاہے کو بیاہی بدیس رے لکھی بابل مورے
بھائیوں کو دیئے بابل محلے دو محلے ہم کو دیا بدیس رے
لکھی باب مورے

ہم تیرے انگنا کی بھولی چڑیاں چگیں، پئیں، اڑ جائیں رے
لکھی باب مورے

سونا بھی دینو، روپیا بھی دینو، دینو رتن جڑاؤ رے
لکھی باب مورے

خسرو کا مندرجہ بالا گیت میں ہمارے موجودہ سماج کا عکس بھی جھلکتا ہے۔

مگر جب یورپ کے صنعتی معاشرے نے ہماری زندگی پر اثر ڈالا تو ہمارے معاشرہ میں بھی تبدیلیاں واقع ہونے لگیں۔ اب عوام بھی اپنی گیت تخلیق کرنے کے بجائے فلمی گیت گانے لگے۔ یہ الگ بات ہے کہ " تخلیق گیتوں" کے مقابلے "فلمی گیتوں" کو پست اور سطحی تصور کیا جاتا ہے۔7

تقسیم کے بعد اردو ادبی اور فلمی گیت کے فروغ میں جن شعرا نے حصہ لیا ان میں قتیل شفائی، مجید امجد، منیر نیازی، تنویر نقوی، سیف الدین سیف، ناصر شہزاد، سعید گیلانی، صوفی تبسم، صہبا اختر، قابل ذکر ہیں۔

گیت ہندی ہو یا اردو اس کا خاص موضوع محبت رہا ہے۔ پاکستانی معاشرے میں مرد کو مجازی خدا کا درجہ حاصل رہا ہے۔ عورت اپنے مجازی خدا کو اپنا دیوتا مان کر اس کی پجارن بن جاتی ہے۔ اسے خوش رکھنے کے ہزاروں جتن کرتی ہے۔

تنویر نقوی کے گیت میں اس کا اظہار یوں ہوتا ہے۔

چنگ بجے، تارے سجے غنچے کھلے نور کے
مہندی رچی، سہرے گندھے آئے صنم دور کے
جھکنے لگا جس کے لیے، ہیروں جڑا آسماں

یہ والہانہ پن جیب جالب کی فلمی گیت میں بھی نظر آتا ہے۔

من تو پہ واروں تن تو پہ واروں
بگڑی بنادے میری رو رو پکاروں

محبوب کی جدائی میں اس کا انتظار کرتی ہے۔ سکھیوں سے اپنا دکھ بانٹتی ہے اور اس سے مدد مانگتی ہے کبھی محبوب کے لیے سندیسہ لکھواتی ہے تو کبھی سکھی سے کہتی ہے کہ اس کی بے تابی کا حال جا کر اس کے محبوب کو بتائے تا کہ وہ جلد ملنے آ جائے۔ جیسے الطاف مشہدی کے گیت ملاحظہ کیجئے۔

کون بند ھائے دھیر پیا بن کون بند ھائے دھیر
پی دیکھیں کو نین ترسیں ہونٹوں سے انگارے برسیں
پریم کا من میں تیر
کون بند ھائے دھیر پیا بن کون بند ھائے دھیر
دیس بد میں پیا کو ڈھونڈوں کھول کے کیس پیا کو ڈھونڈوں
گا کر رانجھا ہیر
کون بند ھائے دھیر پیا بن کون بند ھائے دھیر
(الطاف شہدی)

اب فلمی گیت ملاحظہ کیجئے۔

چٹھی زرا سیاں جی کے نام لکھ دے۔
حال مرے دل کا تمام لکھ دے۔
(تنویر نقوی۔فلم "دوستی")

یا

میرے پیا کو ڈھونڈ لاؤ لکھی

(تنویر نقوی۔فلم" گھونگھٹ")

ادب سماج کا آئنہ دار ہوتا ہے اور سماج میں اچھائی کے ساتھ ساتھ برائی بھی پنپ رہی ہوتی ہے۔ پاکستانی اردو گیتوں میں جہاں محبوب کے لیے جان نچھاور کرنے کا جذبہ نظر آتا ہے وہیں بے وفائی سے ملنے والی اذیتوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔

قتیل شفائی نے ایک برہن کی تڑپ کو یوں گیت میں سمو دیا:

دیا جلے ساری رات
جل جل جائے، نیر بہائے، مجھ برہن کے ساتھ
دیا جلے ساری رات
دور کہیں، باجے شہنائی
تڑپ رہی اپنی تنہائی
چھوڑ دیا ایک ہرجائی نے تھام کے میرا ہات
دیا جلے ساری رات

فلمی گیت میں بھی بے وفائی کا دکھ اس شدت سے نظر آتا ہے

سیف الدین کا یہ گیت دیکھے۔

وہ خواب سہانا ٹوٹ گیا، امید گئی ارمان گئے
اے دنیا ہم سے چال نہ کر ہم خوب تجھے پہچان گئے۔
(فلم،"لخت جگر")

یہ بھی دیکھیں۔

بے وفا ہم نہ بھولے تجھے
ساری دنیا نے ہم سے کہا بھول جا
(سیف الدین سیف،"انارکلی")

اور

جلتے ہیں ارمان میرا دل روتا ہے
قسمت کا دستور نرالا ہوتا ہے
(سیف الدین سیف، "انارکلی")

عورت کے لیے مرد کا بے وفا ہونے سے زیادہ ہرجائی ہونا تکلیف دہ ہے۔ جلن وحسد کا سب سے بڑا مظہر رقیب کے معاملے میں دیکھا گیا ہے۔ مرد کا بیوی کا نظر انداز کر کے دوسری عورت کی محبت ہو یا عورت کا شوہر کی موجودگی میں کسی اور سے چوری چھپے عشق لڑانا، گو کہ یہ معاملات ہمارے معاشرے کے قبیح گوشے ہیں مگر انسانی فطرت کے مظاہر ہیں جنھیں گیتوں میں نظر انداز نہیں کیا گیا۔
مثلاً

بس گیا تو سو تنیا کے دوار سجنا
کہاں ہے تیرا پیار سجنا
(تنویر نقوی فلم، "دوستی")

یا یہ دیکھیں

اک حسن کی دیوی سے مجھے پیار ہوا تھا
دل اس کی محبت میں گرفتار ہوا تھا
(شیون رضوی، فلم "میری زندگی ہے نغمہ")

ہمارے سماج میں مرد عورت کی بے تکلفی یا باہمی اختلاط کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ عشق کا منہ زور جذبہ سماج سے بغاوت پر آمادہ کر دیتا ہے۔ لیکن مرد عورت رسوائی کے خوف سے آزاد نہیں ہو پاتے ہیں۔ ایسے معاملے میں عورت زد پر زیادہ ہوتی ہے۔ اس خوف کا اظہار فلمی گیتوں میں بھی پایا جاتا ہے۔
ملاحظہ کیجئے۔

تیری رسوائیوں سے ڈرتا ہوں
جب ترے شہر سے گزرتا ہوں
(سیف الدین سیف۔ فلم "وعدہ")

چلو کہیں دور یہ سماج چھوڑ دی
دنیا کی رسم و رواج چھوڑ دیں
(ریاض الرحمن ساغر۔فلم "سماج")

نام آئے نہ تیرے پیار کی رسوائی میں
(سیف الدین سیف۔فلم "ثریا بھوپالی")

ہمارے معاشرے میں طبقاتی نظام بہت طاقتور ہے۔ذات پات، اونچ نیچ، امیر غریب کی تفریق سے پیچھا چھڑانا آج تک ممکن نہ ہوا۔محل میں رہنے والے اور کٹیا میں رہنے والی کے پیار کے درمیان اونچ نیچ، بلندی وپستی کی دیواریں حائل ہوجاتی ہیں۔اس کشمکش اور طبقاتی تضاد سے پیدا ہونے والی دوری کو قتیل شفائی کے گیت میں دیکھیے۔

ندی کنارے بگیا جھومے ساجن تجھ سے دور ہوں میں
تاک میں بیٹھا ہے جگ سارا ملنے سے مجبور ہوں میں
تو بگیاں کا رہنے والا
پھولوں کی آغوش کا پالا
میں کانٹوں پر سونے والی
تیری یاد میں رونے والی
میرا دکھیا من کہتا ہے زخموں سے بھرپور ہوں میں
ندی کنارے بگیا جھومے ساجن تجھ سے دور ہوں میں
بگیا میں اک محل ہے تیرا
کٹیا میں ہے اپنا ڈیرا
تو پھولوں کی سیج پہ سوئے
برہن خون کے آنسو روئے

تیرا میرا ساتھ بھی ہو، تو خود سر، مجبور ہوں میں
ندی کنارے بگیا جھومے ساجن تجھ سے دور ہوں میں 8

یہ گیت دیکھے

مجھے پیت کا ہاں کوئی پھل نہ ملا مرے جی کو یہ آگ جلا سی گئی
مجھے عیش یہاں کوئی پل نہ ملا مرے تن کو آگ لگا سی گئی

(عظمت اللہ)

سعید گیلانی کا معروف فلمی گیت بھی سماعت کیجئے۔

سونا نہ، چاندی نہ کوئی محل، جانِ من تجھ کو میں دے سکوں گا
پھر بھی یہ وعدہ ہے تجھ سے تو جو کرے پیار مجھ سے چھوٹا سا گھر تجھ کو دوں گا
سکھ دکھ کا ساتھی بنوں گا۔

(سعید گیلانی۔فلم "بندش")

رسم ورواج کی طرح کھیل اور تفریحی مشغلے بھی مختلف ممالک کی ثقافت کی نمائندگی کرتے ہیں۔
جیسے پاکستان میں کبڈی، پہلوانی کشتی، پتنگ بازی، بٹیر بازی، گلی ڈنڈا وغیرہ۔ یہ تمام تفریحی مشغلے لڑکوں میں مقبول تھے تو لڑکیوں میں گڈے گڑیوں سے کھیلنا، ان کا بیاہ رچانا مرغوب کھیل رہا ہے۔
بچپن کے یہ کھیل تماشے جوانی کی خوبصورت یاد بن جاتے ہیں۔
اس کا ذکر عظمت اللہ نے اپنے گیت میں یوں کیا ہے۔

وہ تمہاری گڑیا کی شادیاں وہ مرا برات کا انتظام
مرا باجہ ٹین کی سیٹیاں بڑا شور و غل بڑی دھوم دھام
تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
مرا بن کے قاضی وہ بیٹھنا کہ بیان اس کا فضول ہے
مرا پوچھنا وہ کڑک کے کیا میاں گڈے گڑیا قبول ہے

تمہیں یاد ہو کہ نا یاد ہو

(عظمت اللہ۔فلم "تمہیں یاد ہو کہ نا یاد ہو")

ہمارے مذہب نے عورتوں کو نامحرم سے پردے کا حکم دیا ہے، اور یہی پردہ گھونگھٹ کی شکل میں ہماری ثقافت کا مظہر بن گیا۔

یہ شرم وحیا، یہ سولہ سنگار، یہ چوڑی ابٹن، یہ گھونگھٹ، یہ پلّو، یہ آنچل، یہ کنگن، پائل بندیا۔ جس کے بغیر ہمارے سماج میں عورت کا تصور ادھورا ہے، اور گیتوں کے لیے تو یہ خاص تلازمے رہے ہیں۔

ادا جعفری کا گیت ملاحظہ کریں۔

گھونگھٹ میں گھنیری رات لیے آنچل میں بھری برسات لیے

سپنوں سے بوجھل بوجھل
دو نین کمل
کچھ گھبرائے، کچھ شرمائے کچھ شرما شرما اترائے
سکھی بھیدی بھید نہ پا جائے کچھ الجھی سلجھی آشائین

نینوں سے اوجھل اوجھل دو نین کمل 9

ایک فلمی گیت بھی دیکھیے۔

گھور اندھیر اساجن میرا رستہ بھول نہ جائے
ڈوب گیا سورج تو میں نے آس کے دیپ جلائے
پھر بھی تم نہ آئے
نینوں میں تم نے میرے کا جل لگایا تھا
کاجل وہ اب تک ساجن ڈھلکا نہیں ہے
سر پہ تمہیں نے میرے آنچل اوڑھا یا تھا
آنچل وہ اب تک سر سے ڈھلکا نہیں ہے۔

(تسلیم فاضلی ۔فلم پیار ہی پیار")

ہمارے سماج میں خاندان کو ایک اکائی کی حیثیت حاصل ہے اور خاندان مختلف رشتوں کا آمیزہ ہوتا ہے۔ ہر رشتے کے احساسات وجذبات اور اندازِ محبت ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔ بے شک ہمارے گیتوں میں محبوب کی محبت کو خاص اہمیت حاصل ہے مگر دیگر رشتوں سے محبت کا اظہار بھی ملتا ہے۔ عورت کے لیے محبوب کے بعد اپنے بچے سے زیادہ جذباتی وابستگی ہوتی ہے۔ بچے سے محبت کا اظہار لوری کہلاتا ہے۔ لوری کے کچھ قدیم بول آج بھی ہماری خواتین کے لبوں پر مچلتے ہیں۔

چندا ماموں دور کے پوڑے پکائے بور کے
آپ کھاویں تھالی میں منے کو دیں پیالی میں
پیالی گئی ٹوٹ منا گیا روٹھ

یہ لوری بھی ملاحظہ ہو۔

اپنی لاڈو کو جھولا جھولاؤں گی رے اپنی لاڈو کو جھولا جھلاؤں گی رے
جب میری لاڈو پیّوں چلے گی پیروں میں پائل پہناؤں گی رے
اپنی لاڈو کو جھولا جھولاؤں گی رے

ساون کے آتے ہی درختوں پہ جھولے ڈل جانا اور سکھیوں کے ساتھ مل کے ساون کے گیت گانا کل کی طرح آج بھی مقبول عام ہے۔ بیاہی لڑکیاں میکے والوں کی راہ تکتی ہیں کہ وہ آ کر میکے لے جائیں جہاں وہ اپنے بہن، بھائی اور بچپن کی سکھیوں کے ساتھ ساون کا لطف اٹھائے۔

خسرو کی طرح میرا جی کے گیتوں میں بھی اس سماجی رویے کا اظہار ملتا ہے۔

آیا بیرن مورا رے

پھر ساون من بھاون آیا آیا مورا بیر، آیا بیرن مورا رے
پھر ساون من بھاون آیا پل میں بن بستی کو سجایا
ساون آیا ٹوٹا دکھ کا بندھن مورا رے
ہنسی بہن بھائی سے مل کر کے اب دکھ دور ہوئے ہیں دل کے

اب تو کوئی سوچ نہیں اب ساون مورارے

اب سرال بنا ہے میکہ حال ہی اور ہے کچھ ہر دل کا

لایا سندیسہ ماں جایا بیرن مورارے 10؎

حوالہ جات

1۔ قیصر جہاں، مرتبہ، مقدمہ، "اردو کے منتخب گیت" لکھنؤ، اتر پردیش، اردو اکادمی، سن (ندارد)، ص9

2۔ بسم اللہ نیاز احمد، "اردو گیت"، مکتبہ نیا دور، کراچی، 1986ء، ص29

3۔ اختر اورنیوی، ڈاکٹر، "تنقیدی مقالات"، مرتبہ مرزا ادیب، لاہور اکیڈمی، لاہور، 1964ء، ص282

4۔ نفیس اقبال، "پاکستان میں اردو گیت نگاری"، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، 2017ء، ص20

5۔ ایضاً، ص175

6۔ حفیظ جالندھری، تعارف، نام ونگ، 1946ء، ص14

7۔ نفیس اقبال، "پاکستان میں اردو گیت نگاری"، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، 2017ء، ص272

8۔ عابد، عابد علی، امیر خسرو، 1962ء کے بہترین مقالے، مرتبہ حلقہ ارباب ذوق، مکتبہ جدید، لاہور، 1963ء، ص177

9۔ نفیس اقبال، "پاکستان میں اردو گیت نگاری"، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، 2017ء، ص ص264 تا265

10۔ ادا جعفری، "میں ساز ڈھونڈتی رہی"، ص152

11۔ "کلیات میراجی"، مرتبہ، ڈاکٹر جمیل جالبی، سنگِ میل، پبلیکیشنز، لاہور، 1996ء